Regd. No. [illegible]

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۲ ۔ شمارہ ۴۳ | ایڈیٹر ۔ آل احمد سرور | ۸ ر نومبر سنہ ۱۹۶۲ء

اداریہ

بہادر شاہ ظفر کی یاد میں

۸ر نومبر کو دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے ایک سو ایک سال بعد، اُن کی یاد میں لال قلعے میں ایک خاص جلسہ ہو رہا ہے۔ دراصل یہ جلسہ گزشتہ سال ہونے والا تھا مگر ہنگامی حالات کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔ شام کو چھ بجے پنڈت جواہرلال نہرو دیوان عام کی سیڑھیوں سے اس جلسے کا افتتاح کریں گے۔ صدارت مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند فرمائیں گے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریر بھی پڑھی جائے گی کیونکہ ڈاکٹر صاحب ایک دوسرے پروگرام کی وجہ سے جلسے میں شرکت نہ کر سکیں گے۔ تقریروں کے بعد مرزا محمود بیگ کا لکھا ہوا ایک فیچر اسٹیج کیا جائے گا اور اُس کے بعد مغل دربار کا ایک رقص پیش ہوگا۔ رات کو ۹½ بجے مشاعرہ ہوگا جس میں اُردو کے ممتاز شاعر ظفر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ اپنا تازہ کلام بھی سنائیں گے۔

جمہوریت کے اس دور میں اس مغل تاجدار سے اتنی محبت کی کیا وجہ ہے؟ یہ بادشاہت کو خراج نہیں ایک محب وطن ہماری پہلی جنگ آزادی کے ایک رہنما اور اُردو کے ایک ممتاز شاعر کو خراج عقیدت ہے۔ یوں تو بہادر شاہ ظفر کی حیثیت انگریزوں کے ایک پنشنر سے زیادہ نہ تھی اور اُن کی حکومت بھی لال قلعے تک محدود تھی مگر جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو سوائے دہلی کے اس تاجدار کے کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو سپاہیوں، راجاؤں اور مختلف مذاہب کے افراد کو ایک مرکز پر جمع کر سکتی۔ بہادر شاہ ظفر ایک صوفی منش آدمی تھے۔ اُن کے درباری اور دہلی والے اُنھیں پیر و مرشد کہا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اُردو میں نہایت قابلِ قدر کلام چھوڑا اور اس کے علاوہ ہندی میں بھی شاعری کی۔ اُن کی ذات میں ہماری مشترک تہذیب کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ افسوس ہے کہ اُن کے بیٹوں میں اتنی دور اندیشی نہ تھی کہ اُس نازک موقع پر جنرل بخت خاں کی مدد کرتے۔ وہ خود اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہادر شاہ کی کوشش یہ تھی کہ صلاحیت رکھنے والے لوگ سامنے آئیں اور اُنہوں نے اس کے لئے تمام راجاؤں سے اپیل بھی کی تھی۔ اگر ہندستانی اُس وقت ذاتی اختلافات کو چھوڑ دیتے اور مل کر کوشش کرتے تو شاید ہماری تاریخ آج کچھ اور ہوتی۔ پھر بھی ۱۸۵۷ء میں جس جذبۂ آزادی کو شدت سے کچل دیا گیا تھا اُس نے وقت کے ساتھ سر اُٹھایا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے کارناموں کو یاد رکھیں اور اُن کی یاد سے وطن، تہذیب، ادب اور انسانیت کی خدمت کے لئے نیا ولولہ حاصل کریں۔

خوشی کی بات ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی قبر کو بھی عزت و احترام کے ساتھ ہندوستان منتقل کرنے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ظفر

اس اشاعت میں

جس تہذیب کے درخشاں ستارے تھے اور جس زبان کے ممتاز شاعر تھے، اس تہذیب و زبان کے فروغ کے لئے بھی ہر ممکن قدم اُٹھانا ضروری ہے اور حکومت اور عوام دونوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اپنے اس فرض سے جلد سے جلد عہدہ برآ ہوں۔ مشترک تہذیب کی قومی اہمیت پر زور تو دیا جارہا ہے، مگر ابھی اس کے سارے عناصر کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح اُردو کو بھی قومی زبان سمجھا جاتا ہے مگر اس قومی زبان کی ترقی میں ابھی بہت سے سنگ گراں حائل ہیں۔

اُردو ادب کا تخلیقی ادب نمبر

ادبی مجلس کی ہدایت کے مطابق اُردو ادب کا سنہ ۱۹۶۳ء کا آخری شمارہ تخلیقی ادب کے لئے وقف ہوگا۔ اس سلسلے میں شاعروں اور ادیبوں کو توجہ دلائی جاچکی ہے۔ اُردو ادب اب تک تحقیق و تنقید کے لئے وقف رہا ہے۔ اس کی یہ روایت ہمیں عزیز ہے اور اس میں فرق نہیں آنے پائے گا، مگر آئندہ سے ہر سال ایک شمارہ تخلیقی ادب کے لئے وقف ہوگا۔ توقع ہے کہ کچھ عرصے بعد انجمن تخلیقی ادب کے لئے ایک علیحدہ سہ ماہی رسالہ نکال سکے گی۔ ہمیں امید ہے کہ اس نمبر کے ذریعہ سے ہندوستانی ادیبوں کے تازہ ترین تخلیقی کارناموں سے ہم اُردو دُنیا کو روشناس کرسکیں گے۔

سیر بین

جے پور میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو شکوے شکایتوں کے دفتر بھی کھلے۔ شکایت کے لئے شعر بہت موزوں ہوتا ہے۔ چنانچہ الگورائے شاستری، مہاویر تیاگی اور بخشی غلام محمد نے اپنی تقریروں کے دوران میں اُردو کے اشعار اور مصرعوں سے بھی کام لیا۔

مہاویر تیاگی تو پہلے سے کچھ اشعار نقل کرکے لائے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بات کہنے کے بعد یہ شعر پڑھے:۔

بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے
سمجھانے والے مُفت گنہ گار بن گئے

اپنوں سے بیر کرلیا غیروں سے دوستی
یاروں کے سرکشادے سردار بن گئے

الگورائے شاستری نے ثاقب کے اس مشہور شعر سے کام لیا۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بخشی صاحب کیوں پیچھے رہ جاتے۔ اُنہوں نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ ابھی کچھ اور لوگوں کو کام راج پلان کے تحت سبکدوش ہونا چاہیے، مزاحاً کہا۔

ع۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

تعجب ہے کہ اس زبان کی گونج تو ہر موقع پر سنائی دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ریاستی حکومتیں انصاف نہیں کرتیں۔

کیرل کی خبر ہے کہ جو مینڈک باہر بھیجے جاتے ہیں اُن سے ہماری سرکار کو پچاس لاکھ سے اوپر کی آمدنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر مینڈک کی کوزکام کیوں نہ ہو، وہ اس نازک دور میں برآمد کی ایک اہم مد فراہم کرتی ہے۔ کاش دوسرے ملکوں میں مینڈکوں کے علاوہ چھچھوندروں اور مکھیوں کے بھی قدردان ہوتے۔ مینڈک کی ٹانگ سنا ہے فرانس میں بہت مرغوب غذا ہے۔

اعظم گڈھ میں اُردو تعلیم کا بندوبست

ڈاکٹر ایف آر بھارتی سکریٹری انجمن پاسبان اُردو سرائے امیر اعظم گڈھ نے ایک مراسلہ میں لکھا ہے کہ شیب نگر ہائیر سکنڈری اسکول میں انجمن کی کوششوں سے اُردو کی تعلیم کا دوبارہ انتظام ہوگیا ہے۔ اس اسکول میں اُردو لینے والے طلبہ کی تعداد ۴۰ ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی

لال قلعہ کے دیوان عام میں ۷ر نومبر کی شام کو سیاست دانوں، شاعروں اور اُردو دوستوں کا ایک عظیم اجتماع آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو خراج عقیدت پیش کرے گا۔ مسٹر نہرو بزم ظفر کا افتتاح کریں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر ہمایوں کبیر وزیر ثقافتی امور اور مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند اپنی تقریروں میں بہادر شاہ کی زندگی اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیں گے۔

ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوگا جس میں ہندوستان کے مشہور شعرا کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ برسی گزشتہ سال ہونے والی تھی۔ ملک کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے رُک گئی تھی اس لئے یہ ایک سو ایک سال بعد ہورہی ہے۔

رسالہ شباب کا اجراء

مولانگر ضلع مظفر پور (بہار) سے اُردو کا ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "شباب" زیر اہتمام نیو مسلم لائبریری جاری ہوا ہے۔ مرتب اسلم آزاد مولانگری ہیں۔ سالانہ قیمت دو روپے۔ فی کاپی پچاس نئے پیسے۔

پتہ۔ دفتر "شباب" بی۔ بی پاکر۔ دربھنگہ (بہار)

سلطان احمد سابق مدیر اتحاد پٹنہ

دارالمطالعہ

شوق کے مشغلوں میں مطالعہ سب سے گہرا اور دیرپا ہے۔ یہ عمر کی قید سے آزاد، بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک قائم رہتا ہے۔ اس کو حواسِ انسانی کا خلاصہ کہنا چاہئے۔ نفس کے لئے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے، جتنا جسم کے لئے ورزش۔ مطالعہ ریاضت بھی ہے اور فرحت بھی۔ یہ اخلاق کا تابندہ ہے اور کردار کا صیقل۔ مطالعے کی ہمہ گیریوں میں دارالمطالعہ وہ مرکزیت رکھتا ہے جو ملک میں دارالحکومت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی قربت سے انسان بنتے اور سنورتے ہیں۔ اگر اس کے ماحول و ما علیہ کو موافق اور ساز گار بنایا جائے تو بہترین افراد پیدا ہوں، کیونکہ جامعہ درسیاتی تکمیل کا دروازہ ہے اور دارالمطالعہ تحقیق و تخلیق کا محل۔ وہاں تعداد کا غرہ اور بے باکی ہے۔ یہاں استعداد کا حجاب و حیرانی۔ اُدھر اسناد میں حروف تہجی کی کثرت، اِدھر اوراد میں معنی الفاظ کی قلت۔ وہ فراغت کا دعوے دار، اور یہ کرامت کا طلب گار ؎

نہیں کتاب سے ممکن تجھے فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

عام پڑھے لکھوں کا ذکر ہی کیا، ایک ماہر فن کو بھی دوسرے فن کی خصوصیات کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ اور یہ تو شاذونادر ہے کہ ہر ماہر تعلیم جملہ علوم و فنون کا واقف کار ہو۔ یہ نہیں کہ دعویٰ سب کا اور حق کسی کا بھی نہیں۔ جب علم لامتناہی ٹھہرا تو منتہی ہونا معلوم۔ لیکن بقدر ضرورت علم ہونا لازمی۔ اس شرط کے باوجود کسی کمی کو گوارا کرنا جہالت اور خسران کو مدعو کرنا ہے۔ یہ عام حالتوں کا ذکر ہے، ورنہ خواص کا علم ذاتی ہو یا لدنی اس کے فضل و کرم پر منحصر ہے اور بعضوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے۔ ہماری تعلیم و تربیت کا تقاضا ہے کہ آئے دن کی ضرورتوں کا اتنا علم و تجربہ ہونا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے جو صورتِ حال کو قابو میں رکھے، اور ناگہانی موقعوں پر امداد کی صورتوں کو بگڑنے نہ دے۔ جس کی ایک بیّن مثال طبی امور میں "پہلی مدد" سے ملتی ہے۔ ورنہ ایک معمولی سی جراحت میں اگر سیلان خون کے نقصان کثیر کو نہ روکا جائے، تو کسی مسیحائے وقت کی آمد بھی اس نقصان کو پورا نہ کر سکے۔ ہمیں اسی تعلیم اور اسی تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر آج قارئین کتب کا یہ حال ہے کہ وہ اگر روپے بھیجنے کے مختلف فارموں کو بھرنا چاہیں، تو ان کے اندراجات میں فاش غلطیاں کریں اور ان کی اس سمجھ پر ماتم کیجئے کہ روپے اور فارم متعلقہ کاؤنٹر کو سپرد کرنے کی جگہ انھیں خطوں کے بکس میں ڈال آئیں۔ شاید یہ مبالغہ ہو لیکن عملی زندگی میں موجودہ درسیات کے جو سانحے سننے میں آتے رہتے ہیں وہ اس سے زیادہ محیر العقول اور جگر خراش ہیں۔ مگر اصلاح کی صورت کیا ہے؟ صرف نصاب اور درسیات ہی نہیں، امتحانات کی ناہمواریوں کا بھی قصور ہے۔ سند کی وہ چاٹ لگائی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ حصول علم کے لئے صرف درسیات کی مدت کافی نہیں جبکہ علم و آگاہی کا سبق ہر قدم پر ملتا ہے اور اس کا سلسلہ مہد سے لحد تک قائم رہتا ہے۔ تو پھر فارغ ہونے کا تصور کس کام کا؟ ظاہر ہے کہ معلومات عامہ کی آسان اور باقاعدہ صورت یہی دارالمطالعے کی تنظیم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک قومی ضرورت کے ماتحت اس نظام دارالمطالعے کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد بنانا ہے۔

دارالمطالعہ ایک ایسی دانش گاہ ہے، جس سے ترقی کے نشانات ملتے ہیں اور تمدن کی راہیں نکلتی ہیں۔ کسی ترقی کا سمجھنا اس پر منحصر ہے کہ اس کا کوئی اندازہ مقرر ہو۔ محض ذہن کی رسائی سے کام نہیں چلتا، اس کے لئے اجتماعی اقدام کرنا پڑتا ہے۔ اس معیار پر آگے بڑھنے کا نام ترقی ہے۔ ورنہ جنگل کے درختوں کی پیدائش اور باغ و چمن کی آرائش میں کوئی فرق نہ ہو۔ وہ قدرت کی بخششوں کا کرشمہ ہے اور یہ اس کے عطیۂ عقل و شعور کا نتیجہ۔ وہ حال سجدۂ شکر کا مستحق اور یہ کیفیت بار امانت کی متحمل۔ کہ اس کی قدرت اور اپنی نسبت کو سمجھنا، انسانیت کا شرف و امتیاز ہے۔ لیکن ہر عمل کے لئے علم مقدم ہے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں بھی اس وقت تک نہیں ہلتے، جب تک ہمارے خیال اور ارادے کا انھیں علم نہ ہو۔ اور لاعلمی میں کوئی حرکت سرزد ہو تو صحت کی دلیل نہیں۔ وقت کی رفتار ہو یا منزل کا نشان، مطالعہ کی اسی رصد گاہ میں دیکھتے ہیں۔ یہاں علم و حکمت کے ذخیرے موجود ہیں۔ جو آئے اپنا دامن بھر لے۔ الفاظ قلم بند اور کتابیں محفوظ ہیں، وہ کھلیں اور یہ پڑھی جائیں تو جادو کا کام کریں۔ عہد مغلیہ میں کتب خانے کا نظم "کن ترقیوں کا حامل تھا اس کا اندازہ ان اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو اکابرین علی گڑھ نے بڑی محنتوں سے جمع کئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم عمل کے ماتحت اس اجتماعی ادارے کے مختلف شعبے قائم کئے گئے جو علیحدہ علیحدہ فن اور پیشے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کے ماہرین اپنے فنون کی حفاظت و ترقی پر مامور تھے۔ اور انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا اور جس درجۂ کمال کو پہنچایا۔ وہ اب ایک عظمت رفتہ کی داستان ہے۔ مگر کسی فن و پیشے کی عظمت و شان اور اس کی ترقی و سربلندی کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ اس کو

اپنے عہد کی قدر و منزلت حاصل ہو۔ اور دوسرے آئین تو انھیں فراموش کر دیں۔ برطانوی عہد اس کے سوا کیا ہے؟ مجرمانہ غفلت یا بزدلانہ حرکت۔ کیسے کیسے فن اور پیشے مٹ گئے اور کتنے ماہرین و فن کار تباہ ہو گئے۔ ان صورتوں کے علاوہ جو سرکاری نظم و نسق سے متعلق تھی یا جن کتب خانوں کو براہ راست شاہی خاندان سے تعلق تھا۔ عہد مغلیہ کے امرا اور عمائدین بھی علم و ادب کے ان سرچشموں کے قائم و جاری رکھنے میں ایک دوسرے کے رقیب بن گئے تھے۔ گویا خاندانوں کی شرافت و تہذیب کا معیار کتب خانوں کی عظمت و قدامت سے وابستہ رہا۔ جو کتب خانہ جتنا بڑا اور پرانا ہوتا اس کا والی و سرپرست اتنا ہی بزرگ اور محترم سمجھا جاتا۔ حتیٰ کہ ذاتی اثر و رسوخ کے معاملے میں کسی نادر و نایاب کتاب کا ایک ورق بھی خریطۂ تعارف سے کم نہ تھا۔ حرف کی وہ کشش دلربائی اور حکایتِ لفظ کی وہ دلنوازی کہ ایک اجنبی سے اجنبی کو قریب سے قریب تر کر دے۔ اب کہاں دیکھنے اور سننے میں آتی ہے!

بعضوں کے نزدیک کتب خانوں کی عظمت کتابوں کی کثرت پر ہے۔ لیکن ان کا بہت تھوڑا حصہ مصرف میں آتا ہے۔ اور جو حصہ مصرف میں آئے، وہی سکۂ رواں ہے۔ بقیہ بطور یادگار، ضرورت ہے کہ ان کہنہ اور بوسیدہ کتابوں کا ایسا خلاصہ تیار کیا جائے جو دستی و دیدہ زیب ہو، انبار چھنٹے اور اندوختہ کام آئے۔ ورنہ گلے سڑے اور برباد ہو جائے۔ اس اعتبار سے کتب خانوں کی توسیع، ان کی تعداد کے اضافہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں کی کثرت پر ہونی چاہیئے۔ وہ چھوٹے اور مختصر ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ آباد ہوں، اور پڑھنے والوں کا حلقہ، کتابوں کے رقبے سے کسی طرح کم نہ ہو۔ آبادی کی یہ ذمہ داری ناظم و نگراں پر عائد ہوتی ہے۔ اس گھر کی رونق کو میزبانیوں سے تعلق ہے۔ جبکہ ایک نعرۂ خوش آمدید آنے والوں کی آدھی ضرورت پوری کر دے۔ اجنبیت اور تلاش کی حیرانیوں کو دور کر دے اور ذوقِ مطالعے کا رجحان پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس، کسی متعلقہ فن کی ایک بوجھل فہرست تلاش کرنے والے کو ایسا گم کر دے کہ مطالعہ کا سارا وقفہ اور جوشِ طلب کا ولولہ بھی اس کی نذر ہو۔ طبیعت اتنی پست اور نڈھال ہو جائے کہ پھر آنے کی ہمت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی تعارف ہو یا نہ ہو، مطالعہ کا تعارف لازمی ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ پڑھنے والے کی غرض و غایت کیا ہے؟ ضرورت کسی متن کی ہے یا شرح کی۔ مقصود کوئی حوالہ ہے یا مباحثہ۔ محض وقتی جذبہ کی تسکین مدنظر ہے یا علم و فن کی تحصیل۔ ان کیفیات کے درمیان کتاب کی دستیابی اور مدعا کے حصول تک ایک کارساز رفاقت ضروری ہے۔ کیونکہ لکڑی اور لوہے کی مشین بھی کتاب ہاتھوں میں تھما سکتی ہے۔ اور کاموں کے بسرعت انجام دینے کی یہ آسان صورت ہے۔ لیکن جہاں کسی مسئلہ کی اہمیت اور اس کے کماحقہٗ انجام دینے کا تعلق ہے۔ وہاں ناظم کی شخصیت، اس کی پُرمعنی خیز نقل و حرکت، ضرورتوں کے سمجھنے کی صلاحیت اور وسائل و رسائل کی قدرت۔ یہ سب ملیں اور کام آئیں تو ظاہر ہے کہ دو طرفہ توجہ، پہاڑ بھی توڑ سکتی ہے۔ صاحبِ خانہ کتاب کی ذات اور اس کی یہ خدمت، کن گرانباریوں کی متحمل و کفیل ہے۔ اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ڈاکٹر ولیم جیرالڈ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:۔

"ایک لائبریرین میں ذہانت، سمجھ بوجھ، عام قابلیت اور اچھا کلچر ہونا ضروری ہے۔ اس کو فرحت بخش اور جاذب شخصیت کا مالک ہونا چاہیئے، اس کے دل میں لوگوں سے محبت کرنے اور ان کی خدمت بجا لانے کے جذبات کا پایا جانا بھی ضروری اوصاف ہیں۔ لائبریرین کے پیشہ میں وسیع ذاتی خوبیوں اور دلچسپیوں کی ویسی ہی گنجائش ہے۔ جیسی کسی اور پیشہ میں۔ لوگوں کو لائبریری کی کتابیں حوالے کرنے کے علاوہ ایک لائبریرین کے لئے اور بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ حالانکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لائبریرین کا کام صرف کتابیں دینا ہے۔ موجودہ حالات میں لائبریرین کے لئے اس امر کے بے شمار مواقع ہیں کہ لوگوں میں تفریح اور ان کے خیالات میں اونچ پیدا کرنے کی سہولتیں پیدا کی جائیں۔ اور حوالہ جات اور تلاش و جستجو کی صورتیں نکالی جائیں۔ لائبریرین کا پیشہ ایسا ہے کہ جس پر تمام دوسرے پیشوں کا انحصار ہے۔ کیونکہ اسے سب قسم کے لوگوں مثلاً استادوں، اخبار نویسوں، ڈاکٹروں، قانون دانوں، دینیات کے ماہروں، انجینیروں، سوداگروں، سپاہیوں، سوشل کارکنوں، کارخانہ داروں، مزدوروں، سرکاری ملازموں، طالب علموں اور گرہستی عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔"

(باقی صفحہ ۸ پر)

ذکاءالدین شایاں

پیامِ شاعر

(ولیم بلیک کے مجموعۂ نظم Song of Experience کی ابتدائی نظم سے)

صدائے شاعرِ رنگیں خیال بھی سُننا!
ہے جس کے سامنے ماضی و حال و مستقبل
ہے جس کے ذہن میں پنہاں خدا کا اک پیغام
لبوں پہ جس کے ہے نغموں کی اک حسین محفل
وہ نغمے جن کو لئے پھر رہی ہے موجِ صبا

وہ اک صدا جو دلوں کو جگا رہی ہے ہنوز
جواب بھی رات کو شبنم کے ساتھ روتی ہے
ہے جس کے قبضے میں اب بھی نظامِ ماہ و نجوم
ضمیرِ شب میں جو نشتر سا اک چبھوتی ہے
وہ اک صدا، یہی پیغام لا رہی ہے ہنوز!

"زمینِ خاک بکف! اے جہانِ خاک آلود!
تڑپ کے ہو بھی جا بیدار فرشِ شبنم سے
شبِ سیاہ کے رُخ پر ہے موت کی زردی
فضائیں جاگنے والی ہیں خوابِ پیہم سے
ہنسے گی صبح، بڑھے گا خمارِ ہست و بود!

اے جہانِ تیرہ و تار! اپنے رقص میں نہ بہک
تجھے یہ رقصِ مسلسل کبھی نہیں جچتا!
(تری یہ چال کبھی لڑکھڑا ئے گی تو نہیں؟)
بساطِ چرخ کے مہرے ۔ یہ فرشِ شبنم کا،
دئے گئے ہیں یہ تجھے ۔ دیکھ! ۔ صبح ہونے تک

کرشن موہن

قطعات

بوسیدہ شاعر

ہوس کے تند ریلے میں بہے جا
ستمگر کے ستم رسنا سہے جا
تجھے دادِ سخن ملتی رہے گی
پرانے رنگ میں غزلیں کہے جا

فکرِ لباس

نادر افکار، دل نشیں جذبات
ذہن کے آس پاس رہتے ہیں
کتنے ہی شاہدانِ معنیٔ شوق
محوِ فکرِ لباس رہتے ہیں

انجمن ترقی اُردو راجستھان

انجمن کا ایک خصوصی اجلاس الطاف احمد صاحب خیری کی صدارت میں ہوا۔ جس میں ساہتیہ اکیڈمی کی امداد سے جے پور میں ۱۵، ۱۶، ۱۷ نومبر ۶۳ء کو ہونے والے مذاکرے اور مشاعرے کے اخراجات، طریق کار اور دیگر امور اتفاق رائے سے منظور کئے گئے۔ مذاکرے کے لئے "ملک کی آزادی اور اتحاد میں ادیبوں کا حصّہ" عنوان تجویز کیا گیا۔ مشاعرے کے لئے طرح:۔

ع جس بام پہ نگاہ پڑی کوہِ طور تھا، منظور کی گئی۔ افتتاح کے لئے گورنر راجستھان شری ڈاکٹر سمپورنانند سے درخواست کرنے کی تجویز کی گئی۔ ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل انتظامیہ کمیٹی کا اعلان کیا گیا ہے۔

(۱) پنڈت رام کشور صاحب ویاس سابق ہوم منسٹر ۔ صدر،
(۲) رائے بہادر پنڈت اوتار نارائن صاحب ۔ کنوینر،
(۳) مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل اسسٹنٹ کنوینر،
(۴) کنور چندر سنگھ ایم۔ ایل۔ اے۔ ممبر،
(۵) منشی چند بہاری لال صاحب صبا ۔ ممبر،

باسنی میں یومِ جاہد

قصبہ باسنی ضلع ناگور میں مفتی خلیل الرحمٰن کی صدارت میں انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام مرحوم جاہد باسنوی کی یادگار کے سلسلے میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ جوہر مکرانوی، صبا سعیدی، اور ناصر مکرانوی کے نعتیہ کلام کے بعد مفتی خلیل الرحمٰن نے اُردو زبان و ادب کے ارتقا اور اس کی قومی حیثیت پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آخر میں ناصر الدین مکرانوی نے حاضرین اور خاص طور پہ انجمن کے سرگرم کارکن جناب ظہورالدین ظہور اور صدرِ انجمن غلام محمد صاحب کا شکریہ ادا کیا، اور ان حضرات کی مساعی جمیلہ کو سراہا کیونکہ انھیں کی کوششوں سے اس علاقے میں اُردو زبان کے چرچے شروع ہوئے۔

اجمیر میں یومِ قابل

اجمیر کی ایک خصوصی مجلس میں اُردو کے ممتاز جواں مرگ شاعر حضرت قابل اجمیری کی یاد میں "بزمِ قابل" کا قیام عمل میں آیا جس کے کنوینر احمد علیس منتخب کئے گئے۔ یومِ قابل ۲۵ ر نومبر کو منایا جائے گا۔

مراسلات

کیا مشاعروں اور فلمی غزلوں سے اُردو زندہ رہ سکتی ہے

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

محترم خواجہ احمد عباس صاحب نے بمبئی کے ہفتہ وار اخبار بلٹز کے اُردو ایڈیشن کے پچھلے پرچے میں "ایک اخبار جو آج جنم لے رہا ہے" کے عنوان سے ایک مضمون شایع فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو مر نہیں سکتی کیونکہ جو مشاعرے ہوتے ہیں اور فلموں میں جو اُردو غزلیں گائی جاتی ہیں اور جو اخبار اور رسایل شایع ہوتے ہیں ان کے مدنظر ہندوستان میں مر نہیں سکتی۔

کیا یہ صحیح ہے؟ اس کے متعلق غالبؔ کا یہ مصرع پیش کیا جا سکتا ہے کہ: دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

مانا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مشاعرے زیادہ سے زیادہ ہونے لگے ہیں، اور جو فلم ہندی کے نام سے تیار ہوتے ہیں ان میں اُردو گانے گیت اور چند شعر کی غزلیں ضرور ہوتی ہیں مگر کیا ان کے بل بوتے پر بھی یہ دعویٰ حق بجانب ہو سکتا ہے کہ یہاں اُردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے انصاف کو پیش نظر رکھ کر اُردو کی پندرہ سال پہلے کی حالت اور موجودہ حالت کا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ شمال سے جنوب تک اُردو کا زوال ہی زوال ہو رہا ہے۔ اُردو کے جو مرکز شمال اور جنوب میں تھے یعنی دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد یہاں اُردو کی کیا حالت تھی اور اب کیا حالت ہے تو بہ یک نظر واضح ہو جاتا ہے اُردو زندہ نہیں رہ سکتی۔

(۱) دہلی میں بیسیوں اُردو کے پبلشر تھے اب کہاں باقی ہیں۔ ایک دو جو پبلشر باقی ہیں ان کی حالت بد سے بدتر ہے۔ اُردو کی کتابیں شایع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پُرانی دہلی کو چھوڑ کر نئی دہلی اور جدید آبادیوں میں اُردو کی گرم بازاری نہیں ہے۔ پندرہ سال پہلے کے مقابل اب خرید و فروخت، لین دین، دفتروں، عدالتوں، کمپنیوں میں اُردو داں مشکل سے ملیں گے۔ اُردو اخبار اُردو رسالوں کے خریدار کس قدر ہیں ان کا حال رسالوں کے مالکوں کے دل بخوبی جانتے ہیں۔ وہ شموماً نقصان میں رہا کرتے ہیں۔ اگر رسالہ شمع یا بانو اور بیسویں صدی وغیرہ چند رسالوں کی مانگ خاصی ہو تو اس کو اُردو کی ترقی ہرگز نہیں تصور کرنا چاہیے۔

(۲) اُتر پردیش یہ وہ منطقہ ہے جہاں اُردو کا سب سے زیادہ چلن تھا۔ آج وہاں کے مدرسوں میں اُردو کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وہ طلبہ جو دینیات کا درس لیا کرتے ہیں اپنے نوٹ ناگری خط میں لکھا کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے پبلشر اور بڑے بڑے ادارے یعنی دار المصنفین وغیرہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اُردو کتابوں خصوصاً علمی اور تحقیقی کتابوں کے خریدار کتنے ملتے ہیں۔ آج کتنے اصحاب اُردو کے رسالے اپنی جیب سے خرید کرتے ہیں۔

۲۲ لاکھ دستخط سے جو محضر صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اب لسانی قانون کے تحت اُتر پردیش نے کیا نصب العین اختیار کر لیا ہے۔ ان سب امور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آج انجمن ترقی اُردو (علی گڑھ) کے کتنے ممبر ہیں، اس کے سہ ماہی اور ہفتہ وار اخبار کے کتنے خریدار ہیں، اس کے مطبوعات کتنے فروخت ہوتے ہیں، اُردو کتب خانے مقفل ہیں، کوئی طالب علم اُردو کتاب کا مطالعہ نہیں کرتا۔ ان سب امور کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بخوبی واضح ہو جائیگا کہ اُردو زندہ نہیں ہے بلکہ اس پر سکرات کا عالم ہے۔

(۳) آخر میں حیدرآباد کا تذکرہ ضروری ہے۔ بے شک آندھرا حکومت نے اُردو کو حکومت کی دوسری زبان قرار دیا ہے مگر پہلی زبان تلنگی کے مقابل اُردو کی کیا حالت ہے۔ دیہات کے قطع نظر تعلقات اور اضلاع میں تلنگی حکومت کی زبان ہے اُردو کا کہیں وجود نہیں۔

۱- جامعہ عثمانیہ جو دیسی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا پہلا مگر کامیاب تجربہ تھا اُردو کے ذریعہ آرٹس اور سائنس، انجنیرنگ اور ڈاکٹری کی تعلیم ہوتی تھی۔ آزادی کے بعد یونیورسٹی کا نیا جائزہ حاصل کیا گیا اور اس کے ذریعہ مہاتما گاندھی جی کے فارمولوں کے لحاظ سے ہندوستانی زبان یونی ورسٹی کی زبان قرار دی گئی جس کو دونوں رسم الخط میں لکھنے کی آزادی دی گئی۔ جب وائس چانسلر کا تبادلہ ہوا اور نئے وائس چانسلر صاحب کرسی پر متمکن ہوئے تو بہ اختیار خود یک جنبش قلم یونی ورسٹی کی زبان انگریزی کر دی مجلس اعلیٰ کے کسی رکن کو زبان کھولنے کی جسارت نہیں ہوئی۔ آج جامعہ کے تحت صرف ایک دو امدادی کالجوں کے سوا پوری طرح انگریزی میں تعلیم ہوتی ہے۔ اور جوابات اُردو میں لکھنے کی جو آزادی تھی وہ بھی سلب ہو چکی ہے۔

۲- حیدرآباد کے مشہور اُردو کے پریس پبلشر بند ہوتے

گئے اور ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ان کو طباعت کا کام نہیں ملتا اور کتابیں خریدی نہیں جاتیں۔

۳۔ حکومت کی جانب سے تلنگی کی ترقی کے لئے لاکھوں روپے کی امداد ملتی ہے اس کے مقابل اُردو کے لئے چند ہزار ملتے ہیں جو تلنگی کے مقابل عشر عشیر بھی نہیں۔

۴۔ اُردو اخبار اور کتابوں کو خرید کر پڑھنے والے کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔

۵۔ اردو کے بہی خواہوں کے نواسے اور پوتے مدرسوں میں اُردو نہیں پڑھتے کیونکہ تلنگی، ہندی، انگریزی کے مضامین کے علاوہ مزید اُردو پڑھنا بچوں پر ظلم ہے۔ اس بناء پر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو زندہ ہے یا زندہ رہے گی۔ ہاں صرف بول چال میں استعمال ہوگی مگر تحریر میں باقی نہیں رہے گی۔ ناگری خط ہوگا اور اُردو کی موجودہ لاکھوں کتابیں صرف جلانے کے کام آئیں گی اور بس۔

(نصیر الدین ہاشمی)

نوٹ: اس خیال پر بحث کی دعوت دی جاتی ہے۔ (ادارہ)

لسانی عصبیت

۱۔ شری بابو رام سکسینہ، شہرت پذیر ہندی لسانیات داں، اپنی کتاب "سامانیہ بھاشا وگیان" میں ہندی زبان کا تعارف دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو کا پکھش اور ساہتیک بھاو ناودیشی ہے۔
> فارسی کی جوٹھن، پر ہندی کی سودیشی۔

پتہ نہیں ہندی والے کیوں اردو کی تنقیص میں ہندی کی تحسین سمجھتے ہیں۔ اب کوئی سکسینہ جی سے پوچھے۔ کہ یہ ہندی میں مستعمل انگریزی نلامات او قاف کیا "جوٹھن" نہیں؟ یہ جو غیر ملکی اسلحے ہم منگا رہے ہیں، دشمنوں سے اپنی حفاظت کے لئے، سکسینہ جی کی نظروں میں تو یہ بھی "جوٹھن" ہوں گے!

۲۔ "جامعہ اُردو" کا ایک ہندی ترجمہ الہ آباد میں "ہندی وشو ودیالیہ" کے نام سے ہندی زبان کی بہترین خدمات انجام دے رہا ہے، بلکہ حلقۂ عمل کے لحاظ سے "جامعہ اُردو" سے کوسوں آگے ہے؛ اسکی "وو ورن پتر کا" سے ایک اقتباس:

> اَنیہ بھاشا بھاشی ہونے کے کارن کیول ساہتیہ میں جو ستھا پر گھشتا وینے کے لئے ہندی بھاشا میں سوی کرت ہیں:۔
> پنجابی، بنگلہ، اڑیہ، اسمیہ، نیپالی، مراٹھی،
> گجراتی، تمل، تیلگو، کنڑ، ملایلم، سندھی
> تتھا سندھی۔

کیوں، اردو پر دروازے بند کیوں؟ کیا مادری زبان کی حیثیت سے بھی اُردو زبان کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟

۳۔ بین الاقوامی شہرت کا مالک، ماہر لسانیات سنیتی کمار چیٹرجی اپنی جنگلہ کتاب "بانگلا بھاشاتات پتیر بھومی کا" میں ایک جگہ رقمطراز ہے:

> ہمارے ملک میں ہندی یا ہندوستانی زبان ہی کی ترویج اور چلن زیادہ ہے، قریب بیس کروڑ لوگ ہندوستانی بولتے ہیں۔ لیکن جو لوگ صرف خارجی اور بازاری طور پر ہندوستانی نہ بول کر گھروں میں بھی مادری زبان کی حیثیت سے ہندوستانی بولتے ہیں، ان کی تعداد بنگلہ زبان کے بولنے والوں سے بہت کم ہے۔

گویا بنگلہ زبان کی تمام عظمت بھیڑ بکری کی طرح آبادی پالنے رہنے میں ہے؛ اور اس میں ٹیگور اور بنکم کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔

افسوس تو بس اسی کا ہے کہ اُردو والوں کو اپنی زبان سے ایسا متعصبانہ عشق کرنا نہیں آیا!

(اقبال کرشن)

"ہم عشق کے قائل ہیں تعصب کے نہیں ہیں" ادارہ

گلشن داغ

سید فضل المتین صاحب نے ۸ر اکتوبر کے "ہماری زبان" میں جس "گلشن داغ" کا ذکر فرمایا ہے، میں نہایت ہی ممنون ہوں گا اگر سید صاحب موصوف اس گلدستے کے مفصل کوائف سے بذریعہ ہماری زبان یا ذاتی طور پر مجھے مطلع فرمائیں۔ یعنی یہ کہ گلدستہ ماہوار تھا۔ یا پندرہ روزہ یا دس روزہ؟ نیز سائز کیا تھا۔ صفحات کتنے ہوتے تھے، سالانہ قیمت کیا تھی، کس سنہ میں جاری ہوا، کب تک جاری رہا اور اس کے ایڈیٹر کا نام کیا تھا۔ آیا اس میں حصۂ نثر بھی ہوتا تھا یا نہیں؟ اور اس میں لکھنے والے کون کون معروف اشخاص تھے۔

میں آجکل ہندوستان کے اُردو اخبارات و رسائل کی ایک فہرست تیار کررہا ہوں۔ اگر اہل قلم اور صاحبان ذوق اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں اور ایسے اخبارات و رسائل کی فہرست مع کوائف ہماری زبان میں اشاعت کے لئے بھیج دیں یا براہ راست مجھے ارسال فرمادیں، میں ان صاحبان کا اس عنایت کے لئے نہایت درجہ شکر گزار ہوں گا۔

راقم: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	رام گلی نمبر ۳ - بلڈنگ نمبر ۱۰
مہتمم محمد احمد پبلک لائبریری	لاہور (مغربی پاکستان)

بقیہ دارالمطالعہ

یہی نہیں کہ اس مختلف النوع زندگی کے افراد اور ان کے گوناگوں افکار، کتب خانوں میں گزرتے تھا رہتے ہیں۔ بلکہ قابل غور معاملہ یہ ہے کہ اس طلسم خانۂ ہر قلم بند میں صرف ایک شخص کی ذات سے ساری توجہاؤ، شتوسسب کی تسکین وابستہ ہو۔ جب کہ ہر فرد اپنی اپنی خصوصیات ہر کا حامل اور متلاشی بھی ہو۔ ان حالات میں جھوں کی نگرانی یا اور ان کے درمیان ایک راہ نما توازن کا قائم رکھنا کتنا زنہ جمت مرحلہ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کسی ملک کا سربراہ بلیہ یا کسی جماعت کا معلم اپنے حلقے میں کوئی نظم وضابطہ ان دِصورتوں میں قائم رکھتا ہے کہ اسے صرف اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے بھی اس کی برتری وتفوق کا احساس رکھتے ہیں۔ ان خصوصیتوں کے اقرار و استعمال کی نوبت نہ آئے۔ جب بھی کسی حق کا تسلیم کرالینا ہی ہو اس کا مصرف لیتا ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوتے جو ہیں اور یہ خود مطمئن۔ سماعت و اطاعت میں آسانی پیدا ہوتی ہے اور کام آگے بڑھتا ہے۔ لیکن اس خاموش فضا میں افراد ہی نہیں افکار بھی اجنبی ہوتے ہیں۔ یہاں اخلاقی دباؤ کے سوا تعمیل و پیروی کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ ہر شخص ایک مست پندار بنا آتا ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ جس کی سیات سے وہ قطعاً نابلد و ناواقف ہو۔ اس مکدر ماحول میں کسی نظم و ضابطہ کے بحال رکھنے کے علاوہ، ان مختلف الطبع جذبات کی تحلیل اور پھر تحقیق تحصیل کی صورتوں کو بروئے کار رکھنا، کتنے سخت تحمل اور تحمل فراست کا رہین منت ہو گا؟

ان اہمیتوں کے پیش نظر، ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالمطالعہ کی جدید ترین اصولوں پر تنظیم کریں۔ سب سے پہلے ہمیں اس کا فیصلہ کرنا چاہئے کہ وقت کی قلتوں کو دیکھتے ہوئے، عام مطالعہ کے لئے کن کن علوم و فنون کا کتنا کتنا مناسب کے لئے ضروری ہے۔ مطالعہ کو اس معیار پر لانے کے لئے ہمیں علم و فن کے سمندروں کو کھنگالنا پڑے گا۔ تاکہ ان کی ورق پوش موجوں سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی آبیاریاں حاصل کی جائیں۔ مثلاً ادب کے فن کو لیجئے۔ قومی ادب ہو یا ملکی، اس کی حیثیت عالمی ادب کے مقابلے میں کیا ہے؟ اور ادب کو معیار جس بلندی پر پہنچا ہے، اس کا اندازہ ان کی عہد بہ عہد ترقیوں کا ایک ایسا خاکہ، جس سے پورے ادب کا مطالعہ قابو میں آجائے اور یہ معلوم ہوسکے کہ دنیا کا ادب کیا ہے اور اس میں ہماری زبان کے ادب کا کیا مقام ہے؟ اسی طرح تاریخ و فلسفۂ شعر و حکمت اور دیگر علوم و فنون کا معاملہ ہے کہ ہر ایک کا الگ الگ شعبہ و مقام ہے۔ ان شعبوں کی تقسیم اور ان کی ترتیب و تدوین ان صورتوں میں کی جائے کہ کسی علم و فن کی مجموعی ترقی نظر انداز نہ ہو۔ اور اگر کوئی پوچھے کہ ادب کیا ہے؟ تو ملک کا ہر دارالمطالعہ چیخ اٹھے کہ یہ ہے ادب کا خلاصہ اور یہ ہے اس کی رفتار۔ تاریخ کے نشانات یہ ہیں، اور ترقی و تمدن کی راہیں یہاں تک پہنچی ہیں!

بنگلہ اصطلاحات سازی کا کام

کلکتہ ۲۰ ستمبر۔ آج "پوری بھاشا شانگ شود" کی طرف سے ایک صحافتی بیٹھک (پریس کانفرنس) بلائی گئی اور صحافیوں کو بنگلہ اصطلاحات کے چوتھے کتابچے کی پروف کاپیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کتابچے میں سوا سو انگریزی الفاظ کو بنگلہ میں ڈھالا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے تین مطبوعہ کتابچوں میں پانچ ہزار انگریزی الفاظ مترجم ہیں۔ پانچواں کتابچہ مسودے کی صورت میں تیار ہے اور اس میں پانچ سو الفاظ ہیں۔

"پوری بھاشا شانگ شود" حکومت مغربی بنگال کی تشکیل کردہ ایک کمیٹی ہے جو سرکاری کام کاج سے متعلق انگریزی اصطلاحات کا بنگلہ ترجمہ کر رہی ہے۔ جناب سنیتی کمار چٹرجی اس کمیٹی کے صدر نشین (چیئرمین) ہیں۔ کمیٹی کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لسانی عصبیت کو بالائے طاق رکھ کر اردو، ہندی کے الفاظ جابجا بے تکلف اپنا لئے گئے ہیں۔

(شعبۂ خبر رسانی، انجمن توسیع اردو)

ادیبوں اور مترجمین کا اجلاس

(رسالہ پی۔ ای۔ این سے) ادیبوں کا دوسرا کیمپ وزارت ثقافتی امور کے زیر اہتمام دو ہفتے تک حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ اس مرتبہ کیمپ مصنفین اور مترجمین دونوں پر مشتمل تھا، کیونکہ بیش مصنفین جو شریک ہوئے وہ مترجمین بھی تھے۔ کیمپ کے ہر ممبر سے مصنفین اور مترجمین کی عام دلچسپی و مفاد کے موضوع پر ایک ایک مقالہ پڑھ کر سنانے کو کہا گیا تھا۔ چنانچہ روزانہ دو جلسوں میں مقالے پڑھ کر سنائے گئے۔ اور پھر ان پر بحث و مباحثہ ہوا۔ مقالوں کے علاوہ دوسرے عنوانات مثلاً مصنفین کی امداد باہمی کی انجمنوں، مشترک رسم الخط اور علاقائی ادب میں موجودہ رجحانات وغیرہ پر بحث و مباحثہ ہوا۔

تلگو زبان کے مصنف شری پُری پانڈہ اپالا سوامی صدر عمومی تھے۔ ثقافتی امور کی وزارت کے شری کرشنا مورتی نے حق تصنیف کے قوانین سے متعلق بہت کار آمد معلومات بہم پہنچائیں۔ کتب فروشوں اور ناشروں کے فیڈریشن کے نمائندے بھی کیمپ میں شریک ہوئے اور انھوں نے طباعت و اشاعت کے مسائل پر بحث میں حصہ لیا۔ ساہتیہ اکیڈمی کی نمائندگی ڈاکٹر کے۔ ایم جارج کر رہے تھے۔ جنوبی زبانوں کی بُک ٹرسٹ کے نمائندے شری شاردری نے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا اور مترجمین کے نصاب سے متعلق جس کو کیمپ نے ترتیب دے کر منظور کیا تھا کار آمد مشورے دئے۔

عام سرگرمیوں کے علاوہ وزارت نے کیمپ کو ترجمہ کے ایک سالہ پوسٹ گریجویٹ کلاس کے نصاب کا کری کولم بنانے کا خاص کام تفویض کیا تھا تا کہ کچھ تبدیلیوں کے بعد یونیورسٹیاں اور متعلقہ ادارے اُس کو اپنے یہاں جاری کر دیں۔ اس مقصد کے لئے افتتاحی اجلاس میں ہی ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کے ممبر شری پُری پانڈہ اپالا سوامی، پروفیسر ڈی کے بھٹاچاریہ، شری ایل گنڈاپا، پروفیسر جی سی مصرا، شری ستی ایچ۔ وی۔ ساد ترامہ، شری یوگا جیت نادل پوری اور موجودہ مضمون نگار جو اسکے چیرمین تھے، مقرر کئے گئے۔

یہ کری کولم عام اجلاس نے منظور کر لیا۔ اس کی تیاری کے متعلق چند لفظوں میں کچھ وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ سب کمیٹی کے ممبروں کے سامنے کسی ایسے کری کولم کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ یہ کری کولم فن ترجمہ سے متعلق جدید ترین اور عالمی تحقیق کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے جس کی ڈاکٹر بوجن نے اپنی Towards a Science of International Translation نامی کتاب میں اور ڈاکٹر بی۔ ایس۔ برے نے اپنے ایک مضمون میں جو Federation of Translation کے رسالے Babel میں شایع ہوا تھا وضاحت کی ہے۔

جہاں تک ممبروں کی معلومات کا تعلق ہے۔ اس قسم کا نصاب اب تک کہیں مرتب نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستان نے سب سے پہلے پیش قدمی کی ہے۔ مختلف لسانی علاقوں کی پیچیدگیوں کے پیش نظر باہمی افہام و تفہیم اور جذباتی ہم آہنگی سے متعلق ہندوستانی مسائل کی شدت نے حکومت کو ترجمہ کی اہمیت سے بخوبی واقف اور ترجمہ کے معیار اور حیثیت کو ترقی دینے کی ضرورت سے آگاہ کر دیا ہے۔

مصنفوں کے کیمپ کے انعقاد کا خیال پہلے پہلے قدرتی طور پر اُن کانفرنسوں سے پیدا ہوا جن کا سلسلہ وقتاً فوقتاً چند سالوں تک جاری رہا ہے۔ پی۔ ای۔ این آل انڈیا سینٹر نے اس سلسلے میں کچھ قابل قدر اور بیش بہا کام انجام دئے ہیں اُن کے بعد مطالعاتی سمینار قائم ہوئے۔ اگرچہ یہ کانفرنسیں اور سمینار لوگوں کی باہمی میل ملاقات اور ایک دوسرے کو دیکھنے اور سُننے کا موقع دینے کے لئے بہت کار آمد ہیں لیکن ان کی کارروائی تین چار روز میں ہی ختم ہو جاتی ہے مگر کیمپ اپنے ممبروں کو ایک جگہ رہنے اور مسلسل پندرہ روز تک بار بار ایک دوسرے سے ملنے کا موقع دے کر ان میں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی آسانیاں بہم پہنچاتا ہے۔ کیا یہ ایک اہم واقعہ نہیں کہ ایک کشمیری شاعر اور ایک آسامی مضمون نگار حیدرآباد جیسے شہر میں (جہاں ہندوستان کی متعدد روایتیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جدید روایتوں میں آکر جذب ہو گئی ہیں) ایک دوسرے سے مل کر آپس میں دوست بن جاتے ہیں۔

حیدرآباد نے بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ ثقافتی وزارت کے ایس۔ کے سنہا اور ان کے دو رفیق کار شری لاہری اور شری پی۔ ڈی شرما نے کیمپ کا بڑی قابلیت کے ساتھ انتظام کیا۔ نئے لیجسلیٹو ہوسٹل میں ممبروں کے قیام کا آرام دہ انتظام کیا گیا۔ اس عمارت کے کانفرنس اور کھانے کے کمرے خاص سرگرمیوں کا مرکز بنے رہے۔ سیر و تفریح کے لئے دو پروگرام بنائے گئے ایک تو خود حیدرآباد شہر میں خاص دلچسپیوں کے مقامات گولکنڈہ کا قلعہ اور عثمان ساگر دیکھنے کے لئے دوسرا ناگرجونا کنڈہ اور نگر ساگر دیکھنے کے لئے۔ ہندی پرچار سبھا، بنگالی ایسوسی ایشن، انجمن ترقی اُردو، آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی اور آندھرا سواسیتی سمیتی نے کیمپ کے

ممبروں کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ محکمۂ آرکیالوجیکل کے شری اے وحید خاں نے اجنتا کے غاروں سے متعلق پُر از معلومات تقریر کی۔ ممبران آل انڈیا ریڈیو میں بھی گئے۔ جب شری سنہا کیمپ کے مقصد کی وضاحت کرچکے تو اس کے بعد ہر ممبر نے کیمپ سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے۔ نیشنل ٹیکسٹ بک پریس کے افتتاح کے موقع پر آندھرا کے وزیر اعلیٰ نے بھی مصنفین سے ملاقات کی اور گفت وشنید میں حصّہ لیا۔ وزیر تعلیم بھی کیمپ میں تشریف لائے۔ اور ایک مختصر سی تقریر کی۔ محکمۂ تعلیم کے سکریٹری شری ایل این۔ گپتا بھی کیمپ میں تشریف لائے اور ممبروں سے بات چیت کی۔ ہم موصوف کے پُر خلوص تعاون کا جس قدر شکریہ ادا کریں بجا ہے۔

اُردو کے مسایل اور انجمن ترقی اُردو

(سیاست حیدرآباد - ۲۹ر اکتوبر سے) انجمن ترقی اُردو کی مرکزیت کو برقرار رکھنے اور اسی پلیٹ فارم سے متحدہ طور پر اُردو کے مسایل کو حل کرنے کی کوششوں کو جاری رکھنے کی اپیل کرتے ہوئے حیدرآباد کے آٹھ ممتاز علم دوست، اور دانشوروں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے۔ بیان پر مسٹر ڈی راماچ راؤ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مسٹر مخدوم محی الدین، مسٹر اختر حسن، ڈاکٹر عبدالمنان، رائے جانکی پرشاد، مسٹر منوہر راج سکسینہ اور مسٹر غلام پنجتن نے دستخط کئے ہیں۔ بیان حسب ذیل ہے:۔

ادھر کچھ دنوں سے اخبارات میں چرچا ہورہا ہے کہ ایک اُردو کانفرنس منعقد کی جارہی ہے اور ابھی دو برس ہوئے انجمن ترقی اُردو (شاخ آندھرا پردیش) کے زیر اہتمام ایک آندھرا پردیش اُردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ سب ہی اردو دوستوں کی رائے مشورے سے اُردو بولنے والوں کے تہذیبی اور تعلیمی مطالبات تشکیل دیے گئے اور حکومت سے نمایندگی بھی کی گئی جس کے نتائج بھی برآمد ہورہے ہیں۔ ہم اُردو کے خدمت گزاروں کی حیثیت سے یہ واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اُردو کی اشاعت کے لئے علمی، ادبی اور تحقیقی میدان بہت وسیع ہیں۔ جہاں کئی ادارے مصروف عمل ہیں اور بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک ایسے مسائل کا تعلق ہے۔ جو حکومت کی تعلیمی اور نظم ونسق کی حکمت عملی سے پیدا ہورہے ہیں ان سے نمٹنا مدت دراز سے انجمن ترقی اُردو ہند ہی کے ذمہ رہا ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ہاتھوں میں سینچا ہوا یہ پودا برابر پروان چڑھتا رہا ہے اور اب اس تناور درخت نے سب اُردو بولنے والوں کو اپنے سائے میں لے رکھا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کوئی بندھی ٹکی تنگ قسم کی تنظیم نہیں ہے بلکہ ایک وسیع پلیٹ فارم ہے، اور یہی اسکی قوت ہے۔ انجمن کی کانفرنسیں بھی محض اس کے کارکنوں تک محدود نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت مشاورتی اجلاس کی ہوتی ہے جن میں اُردو کے سب ہی کارکن استاد، صحافی اور مصنف شریک ہوتے ہیں اور آپس میں رائے مشورہ کرکے اپنے مطالبات کی تشکیل کرتے ہیں جو حکومت کو پیش کئے جاتے ہیں اور پھر رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے۔ انجمن ترقی اردو اور اس کی کانفرنسوں کی یہی حیثیت اس کی امتیازی خصوصیت ہے اس لئے وہ بھی جو تنظیمی اعتبار سے شاید انجمن سے وابستہ نہ ہوں ان باتوں میں پوری طرح انجمن کے ساتھ ہیں اور اس پر بھرپور اعتماد رکھتے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اُردو کے ایسے مسائل اسی طرح حل کئے جائیں۔ اس طرز کی مرکزیت خود اُردو والوں کے لئے بے حد مفید اور ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُردو کے کوئی بھی خواہ اچھی نیت ہی سے سہی ایسے قدم نہ اٹھائیں جن سے اس اتحاد اور اس مرکزیت کو دھکا پہنچے جو انجمن ترقی اُردو کے پلیٹ فارم کی شکل میں ہمیں حاصل ہے۔

نیپا نگر میں اُردو کا پہلا مشاعرہ

برہان پور سے نیپا نگر ۱۶ میل کے فاصلے پر ایک نئی آباد بستی ہے جہاں ہندوستان میں سب سے بڑا کاغذ کا کارخانہ ہے۔ یہ بستی کی زیادہ تر آبادی کمپنی کے ملازمین اور مزدوروں پر مشتمل ہے جن میں مدراسی، بنگالی، عیسائی، سندھی اور مرہٹے نوّے فی صدی ہیں اور دس فی صدی مسلمان۔ لیکن اُردو کے مشاعرہ نے یہاں بھی پہلی بار وہ تاثرات غیر اُردو والوں کے دل ودماغ پر مسلط کئے ہیں جن سے شعرا حضرات بھی محو حیرت سے ہوگئے۔ دراصل اس مشاعرہ کے بانی نیپا نگر پولس کوتوالی کے انچارج شریمان پوار صاحب ہیں جو ہندی زبان کے اچھے کوی بھی ہیں۔ اسی مقام پر مشاعرہ کا انعقاد سیٹھ بھگوا صاحب کی صدارت میں ہوا۔ شریمان پوار صاحب برہان پور قیام کے زمانے میں وہاں بھی پولس گنیش منڈل کی طرف کوتوالی پر شاندار مشاعرے کراتے رہے جس کا سلسلہ ان کے تبادلے کے بعد بھی جاری ہے۔ پوار صاحب کی اُردو دوستی نے نیپا نگر میں بھی اُردو مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ مشاعرے کے چار دور ہوئے اور مشاعرہ ابتدا سے آخر تک واہ واہ کی صداؤں میں شباب پر رہا۔ اس مشاعرے میں حکام بالا اور کمپنی کے ملازمین کی تعداد زیادہ تھی۔

اقبال نصیب
(جوائنٹ سکریٹری انجمن شاخ برہان پور)

حیدرآباد میں اُردو کا موقف برقرار رکھیئے

(دکن نیوز بحوالہ سیاست حیدرآباد)

مسٹر پی وی نرسمہا راؤ وزیر اطلاعات نے بزم اُردو نظام کالج حیدرآباد کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ اُردو زبان کے فروغ کے لئے ہندوستان میں حیدرآباد سے زیادہ کوئی بہتر مقام نہیں ہے۔ اردو کے بارے میں حیدرآباد خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان بھی حیدرآباد کی ستایش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہماری سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ حیدرآباد میں اُردو کا یہ مقام برقرار رہے۔ وزیر اطلاعات نے بتایا کہ ایمرجنسی کے بعد دیکھا گیا کہ حیدرآباد کے شعرا نے جوش اور ولولہ قوم میں پیدا کرنے کے لئے جتنا کلام لکھا ہے کسی اور مقام کے شعرا نے اتنا نہیں لکھا۔ ایمرجنسی لٹریچر کی حد تک حیدرآباد کو اونچا مقام ملنا چاہیئے۔ محکمہ اطلاعات کی جانب سے اس کلام کو شایع کیا جائے گا۔ اُردو رسالہ "آندھرا پردیش" جو محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کی جانب سے ہر ماہ شایع ہوتا ہے اگرچہ کم تعداد میں نکلتا ہے لیکن ہم اس کو بند نہیں کریں گے تعداد بڑھ جائے تو اس کی ہمت افزائی ہوگی۔ ہم اس پرچے کے ذریعہ حکومت اور وزراء کا پرچار نہیں کرتے بلکہ عوام کو تمام معلومات مہیا کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں لسانی مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد میں تمام زبانیں بولنے اور سمجھنے والے شیر و شکر کی طرح رہتے بستے ہیں اور یہاں زبانوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حیدرآباد کا کوئی فرد ملک کے کسی دوسرے حصہ میں جائے تو وہ وہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کر سکے گا کیونکہ اُردو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ ہندی کے تعلق سے مسٹر نرسمہا راؤ نے کہا کہ آج سے پندرہ سال پہلے ہندی سیکھنے میں ملک کے عوام نے جتنا جوش دکھایا آج وہ باقی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ بعض اشخاص بعض علاقوں میں ہندی کی مخالفت کے لئے کمربستہ ہوگئے اور ہندی کو سیاست سے خلط ملط کر دیا۔ آج ہندی کو اس پیچیدگی سے نکالنا ایک بڑا کام ہو گیا ہے ہندی والوں میں ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے وسعت نظری کو اپنانا ضروری ہے۔ زبانوں کے بارے میں اختلافات افسوسناک اور شرمناک ہیں۔ ان اختلافات کی وجہ سے ملک کمزور ہو سکتا ہے۔ کسی زبان کی مخالفت سے زبان ختم نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں تمام زبانوں کو مساویانہ رتبہ حاصل ہے اور کسی زبان کو کسی زبان پر فوقیت اور برتری حاصل نہیں۔ وزیر اطلاعات نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ ایک سے زیادہ زبانیں سیکھیں اور جہاں تک اُردو کے فروغ کا تعلق ہے ٹھوس خدمت انجام دیں۔

"برار کے محبانِ اُردو سے"

آج سے دو سال قبل برار کے اکثر مقامات بالخصوص امراوتی اور آکولہ میں انجمن کی شاخوں کی تشکیل کے لیئے میں نے اڈہاک کمیٹیاں یا کنوینر مقرر کئے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان مقامات میں سے کسی بھی جگہ باقاعدہ شاخیں تشکیل نہیں دی گئیں۔ آج جب کہ ودربھ میں اُردو زبان کا موقف زیادہ خطرے میں ہے ضلع پریشدوں کے وجود میں آنے کے بعد سے اس کے اسکولوں کو برابر بند کیا جا رہا ہے اور جو اسکول چل رہے ہیں اُن کو مشکلات میں مبتلا کیا جا رہا ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ودربھ بالخصوص برار میں جہاں اس علاقے کے سب سے زیادہ اُردو داں رہتے ہیں، انجمن ترقی اُردو (ہند) کی باعمل شاخیں بنائی جائیں اور منظم طور پر اُردو کے موقف کو بچانے کیلئے جد و جہد کی جائے۔

میں نے اس سے قبل بھی انقلاب اور دوسرے اخبارات کے ذریعے برار کے محبانِ اُردو سے اپیل کی تھی کہ اس علاقے کے شہر شہر اور قصبے قصبے میں انجمن کی شاخیں قایم کیجیے، اور اس سلسلے میں جہاں بھی میری ضرورت ہو بلا عذر مجھے طلب فرمائیے۔ میں شاخوں کے قیام اور دیگر منصوبے کے سلسلے میں ہر ممکنہ تعاون کروں گا۔ آج پھر میں اعلان کر رہا ہوں کہ برار کے محبانِ اُردو بیدار ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ایک ذراسی غفلت سے خطۂ برار سے اُردو کی وہ سیکڑوں سال پُرانی تاریخ جس پر تاریخ ادب اُردو آج بھی فخر کرتی ہے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔

مجھے امید ہے کہ زندہ دلانِ برار اپنی بیداری اور اُردو دوستی کا پورا ثبوت مہیا کریں گے۔ اور ایک بار اُردو کو بچانے کے لئے فولاد کی دیوار بن جائیں گے۔

فیض انصاری۔ ایڈیٹر خیال کامٹی

سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ودربھ ریجن)

انجمن اصلاح و ترقی دراسی

انجمن کی ایک ادبی نشست حافظ محمد شمس الدین انصاری کی صدارت میں ہوئی۔ اختر قریشی نے "عورت در پردہ" پر اور انجم قریشی نے "آج کے اُردو شاعر" پر مقالے سنائے۔ شعری دور میں بیس شعراء نے اپنا کلام سُنایا۔ (انجم قریشی، سکریٹری نشر و اشاعت)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے!

محمد عتیق صدیقی

تبصرہ

امام الہند (تعمیر افکار)

ابوسلمان الہندی
صفحات ۳۸۰، ناپ ۲۰×۳۰/۱۶
جلد دفتی، قیمت چھ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلوب کراچی

ابوسلمان الہندی کی تالیف "امام الہند۔ تعمیر افکار" کا موضوع مولانا آزاد مرحوم کی ابتدائی زندگی اور ذہنی ارتقا کا تجزیہ ہے، جسے مکتبۂ اسلوب کراچی نے شائع کیا ہے۔ ابوسلمان الہندی آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے سکریٹری ہیں اس کتاب کی ترتیب و تالیف کے سلسلے میں "تذکرہ، غبار خاطر، کاروان خیال، نقش آزاد . . . آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (بروایت ملیح آبادی)" اور انڈیا ونس فریڈم (بہ روایت پروفیسر ہمایوں کبیر) کے علاوہ پاکستانی و ہندوستانی اخبارات کے لاتعداد مضامین اور اخبارات ورسائل کے خاص نمبر، جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوئے ہیں، ابوسلمان الہندی صاحب کے پیش نظر رہے ہیں، اور ان سب سے بڑی محنت کے ساتھ انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب، خود مولف کے الفاظ میں "ایک عقیدتمندانہ پیش کش اور حقیقت پسندانہ کوشش ہے"۔

مولانا آزاد کی وفات کے بعد اگر ایک طرف مولانا آزاد کے معتقدین نے مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کے لئے ان گنت مضامین لکھے تو ان کے معاندین نے ہندوستان میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ان کے خلاف مضامین بھی شائع کئے۔ ابوسلمان الہندی نے اس کتاب میں معاندین کے اکثر و بیشتر اعتراضات کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا ہے اور اسکے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

مولانا آزاد پر اب تک صرف دو ہی زاویہ نگاہ سے لکھا گیا ہے۔ معتقدانہ اور معاندانہ۔ لیکن ایک تیسری راہ تحقیق کی بھی ہے، جسے اب تک کسی نے اپنایا نہیں ہے۔ مولانا کے متعلق بعض ایسی باتیں بھی مشہور ہوگئی ہیں جن کا حقیقت سے شاید زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ان میں سے . . ایک باتوں کی ذمہ داری خود مولانا مرحوم پر بھی عاید ہوتی ہے، جو انھوں نے قید و بند کی زندگی کے دوران میں غیر ارادی طور پر بے خیالی میں لکھ دی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا کے بیرونی سفر بھی ہیں۔

ابوسلمان الہندی کی اس کتاب کے مطابق مولانا آزاد نے مغربی ایشیا کے تین سفر کئے ۱۹۰۲ء میں ۱۹۰۶ء میں اور ۱۹۰۸ء میں (ص ۳۷۹)۔ آزاد کی کہانی اور غبار خاطر میں بعض ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء میں مغربی ایشیا کے سفر کئے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں انڈیا ونس فریڈم ہی کو حرف آخر ماننا چاہیئے، جس میں انھوں نے مہادیو بھائی دیسائی کے ایک بیان کی تردید کرتے ہوئے مغربی ایشیا کے صرف ایک ہی سفر کا ذکر کیا ہے جو بیس سال کی عمر میں انھوں نے ۱۹۰۸ء میں کیا تھا (ص۹)۔

ابوسلمان الہندی جیسے نوجوان پاکستانی کے قلم سے "امام الہند" جیسی کتاب نکلنا ہمارے لئے خوشگوار تجربہ ہے۔ یہ کتاب اس خوش آئندبات کی نشان دہی کرتی ہے کہ پاکستان میں صالح ذہن بھی ہیں۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات

مصنف۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ
ناشر۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ
E/1/2۔ اشوک نگر، ایجنٹ پارک۔ کلکتہ ۴۰
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۹۶۔ قیمت ۵ روپے

کیف و کم

مصنف۔ یوسف ناظم
ناشر۔ ادارۂ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد دکن
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۵۲۔ قیمت دو روپے

فردوس گوش

مصنف۔ جوش ملسیانی
ناشر۔ مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔
سائز ۱۸×۲۲/۸۔ صفحات ۲۳۲
قیمت۔ چھ روپے

عجائبات سائنس

مصنف۔ اے۔ احمد بادشاہ
ناشر۔ کتاب گھر۔ جمیل آباد۔ میل وشارم
سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۵۳۶
قیمت۔ ۵ روپے

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن پرنٹر نصیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے شائع کیا